© rasailojaraid.com

کہاں سے چلے تھے	مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ
دو ہفتہ دورۂ روس کی رودادِ سفر	〃
عراق میں نوروز	〃
اسلام میں تعلیم	〃
رسول خدا کا اخلاق و کردار	〃
شب برات	〃
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	〃
رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر	〃
شکوہ و ماتم کسی زندہ ملت کا شیوہ نہیں	〃
مولانا غلام محمد نورگت کے نام	〃
(چند ذاتی اور نجی خطوط کا اقتباس)	

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہاں سے چلے تھے

(مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی)

داستان یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ غالباً ۱۹۲۰ء میں پہلی بار جمعیۃ العلما کے اس اجلاس میں شرکت ہوئی جو حضرت شیخ الہند کی مالٹا سے رہائی کے بعد دہلی میں منعقد ہوا تھا اور جس نے سارے ملک میں جوش و خروش اور بیداری کی ایک ایسی لہر پیدا کر دی تھی جو بالآخر ۱۹۴۷ء میں ایک ایسے عظیم الشان سیلاب کی شکل اختیار کر گئی جو اپنے ساتھ برطانوی حکومت کے سارے قہرمان نظام اور استبداد کی ساری قوتوں کو بہا کر لے گیا۔ آج تک جذبات کی وہ تیز لہر اپنے دل میں موجود اور محسوس ہوتی ہے جو اس اجلاس کے نظارہ سے اب سے ترپن[۵۳] سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔ اس زمانے تک پلیٹ فارم غیر منقسم اور خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ایک ساتھ اور ایک ہی مقام پر منعقد ہوتے تھے جمعیۃ العلما ہند کی یہ نئی تنظیم جس کا ابتدائی خاکہ لکھنؤ میں مولانا عبدالباری کی کوششوں سے بن گیا تھا اسی موقعے پر عالم وجود میں آئی۔ اس زمانہ کے سبھی مشہور اور معزز مسلم علماء اور رہنما اس جلسہ میں شریک تھے۔ اس جلسہ کے صدر حضرت شیخ الہند تھے لیکن ان کی علالت کے باعث ان کی نیابت مفتی کفایت اللہؒ نے کی تھی۔ صدر استقبالیہ حکیم اجمل خاں تھے اور آصف علی اس جلسہ کے انتظام میں پیش پیش نظر آ رہے تھے۔ نمایاں شخصیتوں میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو بھی تھے جنہیں تھوڑے ہی دنوں پہلے جلیانوالہ باغ کے خوفناک واقعہ نے شہرت و عزت کے بام عروج پر پہونچا دیا تھا۔ صدارتی کرسی کے پیچھے دو اور کرسیاں نمایاں جگہ پر بچھائی گئی تھیں جن میں سے ایک پر مولانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبد الباری فرنگی محلی اور دوسری پر گاندھی جی تشریف فرما تھے۔ اس جلسہ میں شیخ الہند کی طرف سے ایک تحریر مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھی، دوسری مفتی کفایت اللہ نے جسے آئینی طور پر خطبۂ صدارت بھی کہا جا سکتا تھا۔ ترکِ موالات کا فیصلہ اسی اجلاس میں ہوا تھا اور اسی اجلاس کی اہم ترین ۔ اور ۔ تاریخی تجویز کے مطابق پانچ سو علماء کا وہ فتویٰ شائع ہوا جس میں حکومت کی ملازمتوں کو حرام قرار دیا گیا تھا اور عدالتوں اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شروع کی گئی تھی۔

اس فتوے کی اشاعت اور تبلیغ کے جرم میں ۱۹۲۱ء میں مفتی نثار احمد کان پوری، پیر مجدد صاحب، مولانا محمد علی اور مولانا مدنی پر مشہور کراچی مقدمہ چلایا گیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک اور بھی زور و شور کے ساتھ پھیل گئی۔ اور مقبولیت و بیداری کے تمام پچھلے ریکارڈ مات ہو گئے۔

اس کے بعد ۱۹۲۱ء کے آخر میں مولانا آزاد کی صدارت میں دوسرا جلسہ ہوا اسی جلسہ میں لطیف کی کہانی والے مشہور مولوی عبد اللطیف گنگوہ کی سب انسپکٹری چھوڑ کر تحریک میں شامل ہوئے اس جلسہ میں قابلِ ذکر واقعہ موپلا تحریک کا تھا۔ مالابار کے موپلوں پر اس زمانے میں برطانوی حکومت نے ظلم ڈھائے تھے جس کا مقابلہ انھوں نے تشدد کے ذریعہ کیا تھا۔ برطانوی حکومت کی پروپگنڈہ مشینری نے اس واقعہ کو ہندو مسلم اختلاف پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا اس کی طرف سے کہا جا رہا تھا کہ موپلوں کے ہندوؤں پر مظالم کو روکنے کے لئے برطانوی پولیس کو گولی چلانی پڑی۔ اس زمانے میں عدم تشدد کا عقیدہ مقبولیت کی اس حد پر پہونچا ہوا تھا کہ سیاسی رہنماؤں کو موپلوں کی حمایت میں دشواری پیش آتی تھی۔ جمعیۃ العلماء کے اس جلسہ میں بھی دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ موپلوں کی حمایت میں تجویز پاس کرنے پر مصر تھا اور دوسرا گروہ اسے عدم تشدد کی پالیسی کے خلاف سمجھتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ صرف تذکرہ اور تشویش کے اظہار تک تجویز کو محدود رکھا جائے۔ مولانا محمد شبیر احمد عثمانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے موپلوں کی حمایت کی تجویز پر بڑی زبردست تقریر کی لیکن مولانا آزاد کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ تشدد کی ایک تحریک تھی اس کا سراہنا مناسب نہیں۔ مظالم شدید ہیں۔ مذمت ٹھیک نہیں۔ اس کشمکش نے جمعیۃ العلماء کے اس جلسہ میں بڑی گرما گرمی پیدا کی لیکن آخر میں مولانا آزاد کے موقف کو ہی حمایت حاصل ہوئی۔

۱۹۲۱ء ہی میں دیوبند میں ایک جلسہ ہوا جس میں آصف علی صاحب نے شرکت کی، یہ جلسہ ترک موالات کے خلاف ایک فتویٰ کی مذمت میں منعقد ہوا تھا جو خانقاہ اشرفیہ سے جاری ہوا تھا۔ مقررین نے اس فتوے کے خلاف بڑی گرما گرم تقریریں کیں لیکن کسی مقرر نے بھی مولانا ظفر احمد تھانوی کا نام لے کر مخالفت کرنے کی ہمت نہیں کی جو اس فتوے کے مصنف تھے۔ نوجوانی کے جوش میں مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے بر سرِ جلسہ کھڑے ہو کر پکار کر کہا:۔

"مولانا نام نہیں لے رہے ہیں" (اس وقت مولانا شبیر احمد عثمانی تقریر کر رہے تھے۔) یہ فتویٰ مولانا ظفر تھانوی نے لکھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے والد عیسائی ہو گئے تھے (اشارہ مولوی عبداللطیف کی طرف تھا جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا) مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری اس جرأت رندانہ سے جلسے میں بڑی سنسنی پھیلی اور میں ملک کے مقتدر رہنماؤں اور علماء کی نظروں میں آ گیا۔

پھر ۱۹۲۱ء ہی میں سیوہارہ کی پولٹیکل کانفرنس منعقد ہوئی، اجتماع بہت بڑا تھا۔ اور حافظ محمد ابراہیم اس کانفرنس کے سکریٹری اور روح رواں تھے۔ سوامی سیتہ دیو اور مولوی عبداللطیف بھی اس کانفرنس میں نمایاں رہے۔ مولوی بشیر احمد بھٹہ کی لیڈری اسی کانفرنس سے چمکی، غرض کہ ہر طرف بیداری، ہلچل اور جوش و خروش پھیلا ہوا تھا۔ آئے دن بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے تھے اور عوام کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انگریز کی حکومت چند ہی دنوں کی مہمان معلوم ہوتی تھی۔

پھر سنہ ۲۲ء آیا اور گیا، میں خلافت، کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے سالانہ جلسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ساتھ منعقد ہوئے جمعیتہ العلماء کے اجلاس کی صدارت مولانا اسحٰق مانسہروی نے کی۔ اسی مقام پر کانگریس میں "چینجرس" اور "نو چینجرس" کے دو گروہ پیدا ہوئے۔ ایک گروہ کے لیڈر مولانا محمد علی اور گاندھی جی وغیرہ تھے۔ دوسرا گروہ اسمبلیوں کی ممبری قبول کرکے اسمبلیوں کے اندر برطانوی حکومت کی مخالفت جاری رکھنے کے حق میں تھا۔ اس گروہ کی رہنمائی موتی لال نہرو اور دوسرے لوگ کر رہے تھے۔

سنہ ۲۴ء میں پشاور کا اجلاس ہوا، اس جلسہ کے صدر حضرت انور شاہ صاحب کشمیری تھے اس جلسہ کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ اس میں مولانا محمد علی اور حسرت موہانی کے درمیان بڑے سخت مجادلہ تک نوبت پہونچ گئی تھی۔ مولانا حسرت موہانی اس زمانہ میں کانگریس کے چینجرس گروپ کے ساتھ تھے، اور اسمبلیوں میں حصہ لینے کے حق میں تھے۔ مولانا محمد علی نے مولانا حسرت موہانی کے اس مشہور شعر ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

کو بدل کر اس طرح پڑھا:۔

چکی کی مشقت بھی بائیکاٹ سے نفرت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

تو مجمع میں بڑی کھلبلی مچی، مولانا حسرت موہانی نے اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن میدان مولانا محمد علیؒ کے ہی ہاتھ رہا۔ اس جلسہ کے صدر استقبالیہ صاحبزادہ عبدالقیوم خان تھے، اس کے بعد کلکتہ میں جلسہ ہوا جس کی صدارت سید سلیمان ندوی نے کی۔

جتنے واقعات کا اب تک ذکر آیا انھیں دیدنی یا زیادہ سے زیادہ شنیدنی کہا جا سکتا ہے۔ یہ سارے واقعات، اجتماع اور جلسے یادداشت میں اس لئے محفوظ ہیں کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھوں نے اور ان کے تاثرات نے وہ پس منظر تیار کر دیا تھا جو آگے چل کر قومی تحریکوں میں شمولیت اور جد و جہد آزادی میں کام کرنے کا محرک بنا اس سے بھی پہلے دیوبند میں جہاں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے بیٹھ کر جد و جہد آزادی اور استخلاص وطن کے خواب دیکھے تھے ایک ایسا ماحول بنا ہوا تھا جو خواہ مخواہ انقلابی خیالات کو اُکسانے کا سبب بنتا تھا۔ وہ زمانہ شیخ الہند کی اسارت مالٹا کا زمانہ تھا اور ریشمی خطوط کی تحریک کا راز منکشف ہو جانے کے بعد اس سے متعلق کارکن بظاہر مختلف کاموں میں مشغول ہو چکے تھے اور پورا دیوبند ایک طرح سے برطانوی پولیس کی چھاؤنی بنا ہوا تھا جہاں سی۔ آئی۔ ڈی اور افسر لوگ ایک ایک مشتبہ آدمی کی نگرانی اور تحقیق و تفتیش میں لگے ہوئے دکھائی دیتے تھے لیکن اس کڑی نگرانی کے باوجود یہ کارکن قومی تحریکوں سے وابستگی اور تبادلۂ خیال کا موقع نکال ہی لیتے تھے۔ میری نشست منشی مہدی حسن[1] صاحب کی دوکان پر تھی، وہ تحریک خلافت کا لٹریچر اور دوسرے پمفلٹ چھاپ چھاپ کر فروخت کرتے اور عوام تک پہونچاتے تھے، مولوی محمد مبین خطیب اور منشی سعید اور منشی مہدی حسن صاحب کی یہ دوکان اس زمانہ میں ریشمی خطوط کی تحریک کے مرکز کے طور پر استعمال ہوتی تھی مولانا آزاد کا مشہور بیان "قول فیصل" مولانا محمد علی کی تقریریں اور سفرنامہ اسیر مالٹا، اسی زمانہ میں شائع ہوئیں میری نشست بھی اسی دوکان پر ہوتی تھی اور حالات حاضرہ پر تبصرے اور بحثیں ہوتیں تو میں بھی ان میں حصہ لیتا۔

پھر کراچی کانگریس ہوئی اور کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے اجلاس اسی شہر میں ہوئے، زمانہ شاید ۱۹۲۳ء کے آخر کا تھا دونوں اجلاسوں کی صدارت مولانا آزاد نے کی گاندھی جی نے کانگریس کے علاوہ جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں بھی شرکت کی اسی موقع پر اجلاس میں موجود علماء کا گاندھی جی سے تعارف کراتے ہوئے مولانا آزاد نے وہ مشہور جملہ کہا جو آج تک میرے ذہن میں تازہ ہے۔ انھوں نے کہا:-

"گاندھی جی! یہاں آپ کے سامنے یہ جو بوریہ نشین علماء بیٹھے ہیں انھوں نے انقلاب فرانس نہیں پڑھا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت مسلمانوں

[1] میرے والد صاحب جو تحریک عدم تعاون کے [illegible] اور ریڈ تون کا کام کرتے رہے۔ (جمیل مہدی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اور پورے ملک میں ان سے بڑی انقلابی جماعت کوئی دوسری موجود نہیں ہے۔"

اس اجلاس کی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ اسی میں تحریکِ عدم تعاون کا نیا موڑ شروع ہوا اور گاندھی جی کی سول نافرمانی کی وہ مشہور تجویز پاس ہوئی جس نے تاریخ میں قانون توڑنے اور ملک بنانے کے نام سے شہرت حاصل کی اور جس کے تحت وہ مشہور ڈانڈی مارچ شروع ہوا جس نے کانگریس کو تمام ملک کی واحد سیاسی طاقت کی شکل میں انگریزوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں اس زمانے میں ڈابھیل میں آگیا تھا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درس و تدریس کے ساتھ فتویٰ نویسی کی خدمات پر بھی مامور تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سراج احمد اور مولانا بدرِ عالم میرٹھی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری یہ سب وہیں جمع تھے کیونکہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری نے مشہور مناقشہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کو چھوڑ کر گجرات کے اسی قصبہ میں اپنا مستقر بنا لیا تھا اور ہم سب لوگ انھیں کے ساتھ ڈابھیل آگئے تھے۔ ڈابھیل سے ڈانڈی تھوڑی ہی دور تھا اور گاندھی جی نے ڈانڈی سے اپنا مارچ شروع کر کے پہلی منزل دھراسیہ میں کی تھی جو ڈابھیل سے ڈانڈی کے راستہ پر ایک گاؤں ہے۔ گاندھی جی کی آمد کی خبر بجلی کی طرح چشم زدن میں سب جگہ پھیل گئی اور ہم لوگ بھی گاندھی جی سے ملنے دھراسیہ پہونچ گئے۔ جس وقت ہم پہونچے تو خیمے لگے ہوئے تھے اور بڑی چہل پہل تھی۔ ہم گاندھی جی کے پاس پہونچے تو وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بڑی خندہ پیشانی سے انھوں نے کہا:۔

آؤ مولانا۔

پھر ہم سے بیٹھنے کو بھی کہنے سے پہلے انھوں نے پوچھا کہ مولانا میں نے سنا ہے کہ آں حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ پانی، گھاس اور نمک پر ڈیوٹی نہیں" میں نے اس کی تصدیق کی تو وہ اور خوش ہوئے اور دیر تک کرید کرید کر تفصیل پوچھتے رہے۔ میں نے تفصیلات بیان کیں تو انھوں نے کہا کہ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ انھیں لکھ کر بھیج دیں۔ ہم سب وہاں دن بھر رہے اور واپس آنے کے بعد میں نے لکھ کر بھیج دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سردار ولبھ بھائی پٹیل اس تحریک کے ہیرو تھے، انھوں نے ہی باردولی میں اس تحریک کو منظم کیا اور یہیں سے ان کی انتظامی اہلیت پورے ملک کے لئے مسلّم ہوئی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اس زمانہ میں ہندو اور مسلمانوں کے غیر متنازعہ اور نہایت مقبول اور محبوب متفقہ لیڈر تھے، اس تعصب اور تنگ نظری کا شائبہ بھی ان کے کردار میں نظر نہ آتا تھا جس نے آگے چل کر ان کی شخصیت کو متنازع چیز بنایا۔ میرا خیال ہے کہ سردار پٹیل کے ذہن کی تبدیلی کا پتہ اس وقت چلا جب انھوں نے ۱۹۴۶ء کے میرٹھ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے "تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ کانگریس کے سبھی چوٹی کے لیڈروں کے ساتھ خود گاندھی جی بھی سردار پٹیل کی زبان سے ایسی غیر متوقع بات سن کر حیران رہ گئے۔

خیر یہ تو بہت آگے کی بات ہے۔ اس وقت تذکرہ تو اس زمانہ کا تھا جب سردار پٹیل نے باردولی کی تحریک چلائی اور انگریزوں نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے تشدد اور مار پیٹ کے ساتھ قید و بند اور جائدادوں کی ضبطی کا بھی خوفناک سلسلہ شروع کر دیا، اس سے لوگوں میں بڑی پریشانی پھیلی، یہیں وہ واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رُخ پلٹ دیا اور اسے ایک خاص سمت لگا کر اس جگہ پہونچا دیا جہاں میں اب نظر آرہا ہوں۔

ہوا یہ کہ جائدادوں کی ضبطی اور نیلامی کے اس خوفناک دور میں گاؤں کے مکھیا نے جو وہاں پٹیل کہلاتے ہیں بحیثیت مفتی کے مجھ سے فتوے پوچھا۔ اس فتوے میں پوچھا گیا تھا کہ عدم ٹیکس کی وجہ سے نیلام پر چڑھی ہوئی جائدادوں کو خریدنا شرعی نقطہ نظر سے کیسا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ ضبط شدہ جائدادوں کو خریدنا ظلم و عدوان کی کھلی حمایت ہے، ایسی جائدادوں کو خریدنا اور اس کی بولی بولنا حرام ہے۔ اس فتوے کا دینا تھا کہ پورے گجرات میں ہلچل مچ گئی۔ پانچ سو علماء کا سنہ ۲۰ئہ کا فتویٰ اور میرا یہ فتویٰ مسلم پریس گجرات نے چھاپ کر لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کیا اور اس فتوے کی وجہ سے وہاں مسلم پریس بھی ضبط ہوگیا۔ ہم اس زمانے میں رمضان کی وجہ سے دیوبند آئے ہوئے تھے میں عید کے بعد کچھ دیر میں پہونچا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد عثمانی مجھ سے پہلے پہونچ چکے تھے جوں ہی شاہ صاحب وہاں پہونچے جامعہ ڈابھیل کے مہتمم مولانا احمد بزرگ نے ان سے میری شکایت کی انھوں نے کہا کہ مولانا! وہ تو فتویٰ دے کر شعبان میں چلے گئے، انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ڈابھیل بڑودہ کی ریاست میں ہے جہاں انگریزوں کی حکومت سے بھی زیادہ مطلق العنانی کی حکومت ہے۔ میں سارے رمضان مارا مارا پھرا ہوں اور اب نہیں کہہ سکتا کہ جامعہ ڈابھیل کا کیا حال ہوگا۔ میں عید کے بعد جس صبح کو ڈابھیل پہونچا تو میرے پہونچتے ہی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے وہاں پہونچ کر فوری طور پر میرا بیان لیا۔ کسی کو بھی اور خود مجھے بھی گرفتاری سے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اس نے مجھ سے جس فتوے کے بارے میں پوچھا کہ وہ میرا لکھا ہوا ہے یا نہیں وہ فتویٰ وہی تھا جو مسلم پریس گجرات میں چھپا تھا اور گجراتی زبان میں تھا میں نے اس فتوے کو دیکھ کر کہا کہ یہ گجراتی میں ہے اور میں گجراتی نہیں جانتا، اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی فتویٰ ہے یا نہیں۔ وہ یہ بات سُن کر اس وقت تو چلا گیا مگر یقین تھا کہ صبح کو ضرور آئے گا اور اصل فتویٰ بھی ساتھ لائے گا۔ یہ دن کی بات تھی، دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ رات کو بارہ بجے گاندھی ارون پیکٹ ہو گیا۔ تمام سیاسی قیدی چھوڑ دئے گئے، اس لئے میں بھی جیل کے دروازے سے واپس آ گیا، گرفتاری نہیں ہوئی مسلم پریس بھی، جو ضبط ہو گیا تھا، چھوڑ دیا گیا، یہ سب تو بخیر و خوبی گذر گیا لیکن جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بل پڑ گیا۔ پہلے بڑے ٹھاٹھ کے مفتی سمجھے جاتے تھے اور دو تنخواہیں ملتی تھیں، ایک مدرسی کی اور ایک فتویٰ نویسی کی۔ اب اڑچنیں پڑنے لگیں، مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ فتوے اہتمام کی نگرانی اور دیکھ بھال کے بعد جاری کئے جائیں۔ ورنہ دو تنخواہوں کے بجائے ہم ایک تنخواہ دیں گے۔ ان پابندیوں سے دل بہت گھبرانے لگا۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی غیر موجودگی ویسے ہی ناقابلِ برداشت بنی ہوئی تھی وہ اس سال سرے سے واپس ہی نہیں آئے تھے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور تجلیل پڑھانے کے لئے دہلی چلے گئے۔ ادھر یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پابندیاں لگیں، بڑی وحشت تھی، کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا جتنا سوچتا طبیعت اور اُلجھتی جاتی، روزگار کا بھی مسئلہ تھا، اُدھر دیوبند میں بھی جھگڑا تھا۔ اِدھر مولانا حفظ الرحمٰن کی مفارقت، طبیعت بہت بےچین تھی اور دل اُکھڑا ہوا تھا پابندی ناقابلِ برداشت تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں اس لئے میں نے طے کرلیا کہ جو فتوے اہتمام کی معرفت آئیں گے اُن کا جواب بھی اہتمام کی معرفت دیدیا کروں گا۔ کچھ دن اسی طرح سے چلتا رہا، ذی الحجہ میں انھوں نے ایک فتویٰ کہیں سے پکڑا اور اس کے بعد ایک تحریر میرے پاس بھیجی کہ آپ نے یہ فتویٰ براہِ راست بھیج دیا اگر آئندہ ایسا ہوا تو شوریٰ کے فیصلے کی رُو سے تنخواہ روک لی جائے گی۔ عبدالحی بٹیل یہ تحریر لیکر آئے تو ایسا محسوس ہوا کہ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ میں نے اسی وقت اس تحریر پر لکھ دیا کہ یہ ناروا پابندی ہے جسے کوئی مفتی برداشت نہیں کرسکتا اس لئے میں اس کی پابندی سے معذور ہوں۔

میرے اس جواب سے سب لوگ پریشان ہوگئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے آزردگی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ مشورہ تو کرلیا ہوتا۔ میرا ذہن اس واقعہ سے اتنا مشتعل تھا کہ میں نے اُن سے کہا کہ میں رات کو یہاں نہیں ٹھہروں گا، میں راندیر جا رہا ہوں۔ یہ مختصر بات کرکے میں راندیر چلا آیا اور مفتی مہدی حسن کے یہاں ٹھہرا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے فوری کوشش کرکے مجلس شوریٰ بلائی تاکہ فیصلہ تبدیل کیا جاسکے لیکن مہتمم نے کورم پورا نہیں ہونے دیا۔ مگر مولانا اس پر بھی مایوس نہیں ہوئے اور انھوں نے جدوجہد جاری رکھی اور مجھے مطلع کیا کہ کوئی فیصلہ ہونے تک میں راندیر سے نہ جاؤں، اسی عرصہ میں مولانا بدرِ عالم کا بھی خط آیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ "آپ کے بعد میں یہاں کیا کروں گا" میں نے انھیں جواب میں لکھا کہ "آپ میری وجہ سے مشکل میں پڑ جائیں گے، میرا تو دل کھلا ہوا ہے اور میں بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے بالکل ٹھیک کیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس جھمیلے میں نہ پڑیں" مولانا شبیر احمد عثمانی کی پیہم کوششوں سے مجلسِ شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ فتووں پر سے پابندی تو ہٹا لی جائے گی لیکن وہ تنخواہ ایک ہی دیں گے۔ دوسری تنخواہ ابراہیم گاردی صاحب نے الگ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینے کا ذمہ لیا اور ایک ہزار روپیہ اس مد میں دے بھی دیا اور یہ کہا کہ وہ پابندی سے اس دوسری تنخواہ کا انتظام کرتے رہیں گے۔

مولانا نے مجھے اس فیصلہ کی اطلاع دی اور یہ لکھا کہ آجاؤ مگر آنے سے پہلے استخارہ کرلو۔ میں نے جواب میں لکھدیا کہ میں تو استخارہ کر کے آیا تھا، اب آپ ہی استخارہ کرلیں، اور استخارہ آجائے تو مجھے اطلاع کردیں، میں آجاؤں گا۔ مولانا میرے اس جواب سے مایوس ہوگئے، اور یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ اس عرصہ میں مولوی محمد موسیٰ نے مجھے خط لکھا اور روپئے بھی بھیجے۔ روپیہ کے ساتھ یہ تحریر بھی آئی کہ میرا خیال ہے کہ حج کر آؤ۔ ویسے پابندی نہیں، ضرورت ہو تو کسی دوسرے استعمال میں لے آؤ۔ یوں اس واقعہ کی بدولت پہلے حج کی سعادت میرے حصہ میں آئی۔

حج سے واپس آکر میں دہلی آگیا اور میں نے مولانا حفظ الرحمٰن اور سراج احمد میرٹھی کے ساتھ مل کر ایک ادارہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس زمانے میں چوڑی والان میں مولوی سعید احمد اکبر آبادی کے مکان پر ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ سنہ ۳۸ء کی بات ہے مجلس علمی کا پہلا مشاورتی جلسہ بلیماران کی کوٹھی علی جان میں ہوا جہاں اس زمانہ میں جمعیۃ العلماء کا دفتر تھا۔ مولانا احمد علی لاہوری مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ نے اس جلسہ میں شرکت کی اور سب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اسی جلسہ میں خواجہ حسن نظامی نے پیشکش کی کہ مشکلات القرآن میں چھاپوں گا اور مجلس کی طرف سے شائع کروں گا۔ یہ تیاریاں پورے طور پر جاری تھیں یہاں تک کہ دہلی آکر مشرب کے نام سے ایک رسالہ نکالنے کے لئے پوسٹر بھی چھاپ لئے تھے کہ حالات میں ایک اور تبدیلی آئی، ہوا یہ کہ بجز ذہنی مشغولیت کے اس زمانے میں کوئی دوسری مشغولیت نہیں تھی، اس لئے سب لوگ ساتھ رہتے تھے اور اکٹھے ہی دہلی میدان میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ نماز کے بعد کچھ ذکر و اذکار اور تقریر کا پروگرام بھی چل جاتا تھا اس زمانے میں اتفاق سے حاجی ادریس (جاپان ہاؤس والے) اور حاجی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسمٰعیل جیون بخش بھی دہلی میں تھے۔ انھوں نے نہ معلوم کیا بات دیکھی کہ مجھ سے متاثر ہوگئے۔ ان دونوں کا شمار ہندوستان کے متمول تاجروں میں ہوتا تھا اور کلکتہ میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا انھوں نے قاضی سجاد صاحب سے میرے متعلق دریافت کیا اور پوچھا کہ مفتی صاحب کیا کرتے ہیں۔ قاضی سجاد نے ان سے میرا احوال بتایا۔ دونوں نے میرے سامنے کلکتہ چلنے کی تجویز رکھی اور اس حد تک اصرار کیا کہ میں بالآخر سارا پروگرام نامکمل چھوڑ کر کلکتہ پہونچ گیا۔ کلکتہ پہونچے تو درسِ قرآن اور فتویٰ نویسی کی خدمت سپرد ہوئی۔ کولوٹولہ کی مسجد میں درس قرآن شروع ہوا تو تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی بہت زیادہ شہرت ہوگئی۔ لیکن تنہائی سے بہت جی گھبراتا تھا خصوصاً مولانا حفظ الرحمٰن کی جدائی اتنی شاق تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں رمضان سے پہلے کلکتہ پہنچا تھا اور آخر رمضان تک یہ حالت ہوگئی کہ کسی کام میں طبیعت نہیں لگتی تھی، اس زمانہ کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کلکتہ میں ایک آدمی آواز لگا کر تعویذ بیچا کرتا تھا اور اس تعویذ کی اور خصوصیات میں یہ خصوصیت بھی بتایا کرتا تھا کہ اس کی برکت سے تسکین قلب حاصل ہوسکتی ہے۔ تو ایک دن بے ساختہ تعویذ لینے کو دل چاہا خیر تعویذ تو نہیں لیا۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ دل کتنا اُلٹا ہوا تھا۔ اصل میں میری اور مولانا حفظ الرحمٰن کی روحیں اتنی ملی ہوئی تھیں کہ ایک کو دوسرے کے بغیر قرار نہیں ملتا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن اس دنیا میں نہیں ہے اور میں جو ان کی جدائی کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے بغیر زندہ رہنے اور صبر کرنے پر مجبور ہوں۔ میں نے اپنی حالت کا اظہار وہاں کے لوگوں سے کیا تو انھوں نے تجویز پیش کی کہ چنوٹیوں کی ایک انجمن تبلیغ اسلام ہے، مولانا وہاں آجائیں میں نے مولانا کو باقاعدہ خط لکھنے اور دعوت دینے کی تجویز پیش کی جو انھوں نے منظور کرلی۔ میں نے مولانا کو لکھا اور زور دیا کہ فوراً کلکتہ آجائیں محرم میں مولانا بھی آگئے اور ان کی پہلی تقریر محرم میں ہی ہوئی۔ آن کا آنا تھا کہ عید آگئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد مولانا سعید احمد بھی کلکتہ پہونچے اور مدرسۃ العالیہ میں ملازم ہوگئے۔ اب صورت یہ بن گئی کہ کولوٹولہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی مسجد میں تو میرا درسِ قرآن ہوتا تھا اور رجبال الدین کی مسجد میں مولانا حفظ الرحمٰن کا، اب میں کہتا ہوں کہ اتفاق اور محبت کی ایسی مثال مشکل ہی سے ملے گی جو مولانا کے اور میرے تعلقات میں جاری وساری تھی۔ جیسا کہ قاعدہ ہے جب ایک ہی جگہ پر دو دو آدمیوں نے درس و تدریس اور تقریر و تذکیر کا سلسلہ شروع کیا تو کچھ لوگوں نے مولانا حفظ الرحمٰن اور کچھ لوگوں نے میری تعریف شروع کی اور ایک کو دوسرے پر فضیلت دینی چاہی لیکن لوگ اپنی اپنی کہتے رہے اور ہم دونوں کے ذہن میں کبھی خیال تک بھی نہیں گذرا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم دونوں کی ہمہ وقت کی یکجائی نے باقی لوگوں کے لیے شناخت تک مشکل کر دی تھی اور لوگوں کو یہ بتلانے میں دقت پیش آتی تھی کہ عتیق الرحمٰن کون ہے اور حفظ الرحمٰن کون۔ اکثر مختلف معاملات میں نام مخلوط ہو جاتے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا آزاد سے بھی ملاقات کے بہت موقعے رہے، وہ اے ۱۹ تالی گنج کی کوٹھی میں رہتے تھے اور بڑے سخت حالات اور مالی دشواریوں میں مبتلا تھے، حالت یہ تھی کہ تنگدستی کی وجہ سے گاڑی انھوں نے بیچ دی تھی اور چونکہ گاڑی کے بغیر سفر نہیں کرتے تھے اس لیے ہفتوں کوٹھی سے نکلنے کی نوبت نہیں آتی تھی اسفار تقریباً بند تھے۔ مولانا کی عادت تھی کہ وہ سفر خرچ یا کرایے کے نام پر کبھی پیسہ نہیں لیتے تھے، اس لیے انھوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی شرکت کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لیے سفر نہیں کریں گے۔ ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں شرکت کا موقع آتا تو مولانا قرض کے ذریعے اس کے سفر خرچ اور اخراجات کا انتظام کرتے۔

ایک دن آثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ "علائق میں بس یہی ایک کانگریس ورکنگ کمیٹی میں شرکت کی پابندی باقی رہ گئی ہے سوچتا ہوں کہ اس بندش کو بھی توڑ دوں۔"

مولانا آزاد سے ہر پندرہ دن میں ایک بار ملاقات ہوتی تھی اور بڑی دیر تک گفتگو رہتی تھی، اس زمانے میں ان کی مالی حالت اتنی خراب تھی کہ انھوں نے اپنی کوٹھی کا نچلا حصہ ایک یہودی کو کرایہ پر دے دیا تھا۔ صورت یہ تھی کہ کوٹھی کا کرایہ تو ان کے ذمہ چڑھتا رہتا اور یہودی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وصول ہونے والے کرایہ سے وہ اپنا کام چلایا کرتے تھے۔ آخر میں جب شیخ مبارک علی اینڈ سنس نے مولانا کو ترجمان القرآن کی رائلٹی کے اکیس ہزار روپے دئے تب کہیں جا کر ان کے حالات نسبتاً آسان ہوئے، میرے کلکتہ کے دوران قیام ہی میں تاجپوشی کی تقریبات کے بائیکاٹ اور سبھاش چندر بوس کی مائر کنٹیکٹ کی مشہور تحریک کے واقعات پیش آئے اور ان میں میں نے حصہ لیا لیکن ان سے پہلے ایک دلچسپ حادثہ کا تذکرہ ضروری ہوگا۔ اسی زمانہ میں قریب کی ایک مسجد میں مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے جو جماعت اہل حدیث کے بڑے عالموں میں تھے کوئی قابلِ اعتراض تقریر کی جو میرے نام لگ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تقریر میری ہی اس زمانہ میں مشہور تھی جب پولیس کو یہ اطلاع ہوئی کہ کوئی قابل اعتراض تقریر ہوئی ہے تو قدرتاً ان کا خیال میری ہی طرف گیا۔ لال بازار کے تھانہ سے اطلاع آئی کہ چلیے، میں انسپکٹر کے ساتھ چلا گیا، وہ جمعہ کا دن تھا اور میرے ذمہ ہر جمعہ سے پہلے ایک گھنٹہ کی تقریر بھی تھی، تقریر کے وقت میرا پتہ نہ چلا تو تشویش پیدا ہوئی۔ مولانا حفظ الرحمٰن کو معلوم ہوا کہ مجھے پولیس لے گئی ہے تو بہت بگڑے۔ رفاقت اور ذمہ داری کا یہ احساس کہ سب سے پہلے تو جمعہ میں میرے بجائے تقریر کی اور جمعہ کے بعد تھانے آ پہنچے۔ دو گھنٹہ کی تحقیق و تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ وہ تقریر میری نہیں بلکہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی کی تھی تو گھر جانے کی اجازت ملی۔ بہر حال چار پانچ گھنٹے کے بعد واپس آیا۔ اس کے فوراً بعد تاجپوشی کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہوئی تو کولوٹولہ کے محلہ کے اکثر لوگ تاجر پیشہ ہونے کی وجہ سے حکومت کے خلاف کوئی کام کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

زبان سے تو انھوں نے کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی خواہش تھی میں کوئی کام ایسا نہ کروں جو حکومت کے خلاف ہو، اور غلط فہمی کا سبب بن سکتا ہو۔

اُدھر تاجپوشی کے موقع پر روشنی کے انتظامات ہو رہے تھے، اِدھر میں نے پوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طاقت کے ساتھ اس کے خلاف مہم چلا دی یہاں تک کہ ایک زبردست تقریر روشنی کے انتظام کے خلاف کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے سربرآوردہ حضرات کی خواہش کے باوجود روشنی نہیں ہوئی۔ کوئی بولا تو نہیں لیکن ایک چبھن پیدا ہوگئی، اس عرصہ میں ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ مولانا حفظ الرحمٰن کو درد سر کے شدید دورے شروع ہوگئے اور انھیں مجبوراً واپس چلا جانا پڑا۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس واقعے سے پہلے ہی جا چکے تھے جہاں اُن کے لڑکے کی وفات بھی ہوگئی تھا چونکہ روشنی کا واقعہ تو ایک بہانہ ثابت ہوا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی واپسی کے بعد ہی میری طبیعت اکھڑ چکی تھی۔ میں نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو مجلس علمی کی تحریک پھر سے زندہ ہوئی۔ وہاں کے لوگوں کے اصرار کے باوجود میں دہلی چلا آیا۔ جاپان والوں نے مجھ سے یہ پیش کش کی کہ اگر میں کلکتہ میں رہ کر یہ کام کرنا چاہوں تو وہ اس کے کل اخراجات خود برداشت کریں گے اور اگر دہلی میں رہ کر کرنا چاہوں تو پانچ ہزار روپیہ اس کام کے لئے دیں گے۔ میں نے دہلی کے قیام اور پانچ ہزار روپیہ کو ترجیح دی اور دہلی چلا آیا۔ دہلی آتے ہی سیدھا امروہہ مولانا حفظ الرحمٰن کو لینے کے لئے چلا گیا۔ مولانا اس وقت امروہہ میں مقیم تھے اور مولانا محمد میاں کے مکان پر رہتے تھے۔ امروہہ میں دو مدرسے تھے۔ ایک محلہ چلّہ کا مدرسہ اور ایک پان باڑی کی جامع مسجد کا مدرسہ، ان دونوں کے درمیان ہمیشہ سے ہی بڑی شدید مخالفت رہتی تھی، مولانا نے ان دونوں مدرسوں کے اختلافات کو ختم کرنے میں بڑی زبردست کوشش کی اور دونوں کو ملا کر ایک کر دیا اور دونوں کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے لیا میں نے مولانا حفظ الرحمٰن سے مجلس علمی کے آغاز کی تجویز اور پانچ ہزار روپیہ سرمایہ کا ذکر کیا تو وہ حسب معمول جیسی ان کی عادت تھی بحث و مباحثہ پر اتر آئے، کہنے لگے کہ مفتی صاحب آپ کے بھی کام ایسے ہی ہوتے ہیں: اتنے بڑے بڑے کام پانچ ہزار میں کہیں ہوا کرتے ہیں، فضول پریشانیاں مول لینے سے کیا فائدہ، میں اس طرح سے وقت ضائع کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ آخر اسی جھگڑے میں رات کا ایک ڈیڑھ بج گیا۔ میں نے آخر میں اُن سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا کہ اگر کرنا ہے تو اس سے بہتر کوئی موقع نہیں۔ آپ اس کام کا یہ پہلو کیوں نہیں دیکھتے کہ کام کرنے سے پہلے ہی پانچ چھ ہزار روپے مل گئے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ کام کرتے برس گزر جاتے ہیں اور سرمایہ کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ اس لئے کسی خلجان میں پڑنے کی ضرورت نہیں بس آپ سیدھے میرے ساتھ چلئے۔ میرے اس شدید اصرار کے بعد مولانا مجبور ہو گئے اور میرے ساتھ دہلی چلے آئے۔ دہلی میں آنے کے بعد پھر ایک مشاورتی مجلس ہوئی جس میں ہمارے علاوہ ظفر الملک علوی، فارقلیط صاحب اور غازی صاحب بھی شریک ہوئے "ندوۃ المصنفین" نام غازی صاحب کا تجویز کیا ہوا ہے، غازی صاحب اس زمانہ میں فارقلیط صاحب کے ساتھ الجمعیۃ میں تھے، لیکن دونوں کی تنخواہ نہیں، یہ واقعہ ۱۹۳۸ء کا ہے "ندوۃ المصنفین" نے اپنے قیام کے فوراً بعد علمی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ اس کے رسالہ برہان نے بھی علمی اور ادبی معیار کے لحاظ سے بڑی شہرت حاصل کی اور اس کے رفیقوں کی تصنیفات نے بھی علمی، تاریخی اور اسلامی خدمات کا جو شاندار ریکارڈ بنایا، وہ کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

پھر ۱۹۴۷ء آیا، دلی میں آگ لگی، سارا شہر قتل و غارت، لوٹ مار اور آتش زنی کی بھیانک وارداتوں سے جہنم بن گیا، قرول باغ جہاں ندوۃ المصنفین کا دفتر تھا مکمل طور پر فسادیوں کی نذرِ آتش ہو گیا، کشیدگی انتہا پر تھی اور سب لوگ مجھ سے اصرار کر رہے تھے کہ میں قرول باغ کو چھوڑ دوں لیکن میں نے کسی کی نہیں سُنی اور بدستور وہیں مقیم رہا مولانا حفظ الرحمٰن روزانہ گاڑی میں بیٹھ کر خیر خبر کے لئے ندوۃ المصنفین کے دفتر ضرور آتے تھے مسلم لیگ کے صدر شیخ عبدالسلام بھی باوجود نظریاتی اختلاف کے خبر گیری رکھتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس شام کو بھی حافظ نسیم کی گاڑی میں ندوۃ المصنفین آئے تھے جو قرول باغ میں ہماری آخری رات تھی، صبح آئی، تو صبح قیامت تھی۔

ندوۃ المصنفین کے دفتر کو آگ لگادی گئی۔ ساری کتابیں، سارا سامان نذرِ آتش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دیا گیا۔ ایک ٹال والے کے یہاں بیوی بچے پناہ گزیں ہوئے اور ہم قصاب پورہ کے مدرسہ رحمانیہ میں جا پہونچے، قتل و غارت اور تباہی کی وہ شدت تھی کہ چار دن تک باوجود کوشش کے کوئی خبر لینے بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکا۔ کچھ لوگوں نے تو یہ خبر بھی سُن لی کہ مفتی صاحب قتل کر دیئے گئے۔ چار دن تک ہماری کس مپرسی کا یہ عالم تھا کہ خورد و نوش کی کوئی چیز ہمارے پاس نہیں تھی، کہیں سے تھوڑے سے گیہوں مل گئے تھے وہی اُبال لیتے اور کھالیتے تھے، پانچویں دن مولانا حفظ الرحمٰن پہونچے اور وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکال کر لے آئے۔ یہاں پہونچنے کے بعد پھر سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کریں۔ شہر کے حالات معمول پر آئے تو میں نے دوبارہ ندوۃ المصنفین کو اُٹھانے کی ٹھانی۔ مولانا حفظ الرحمٰن حسب معمول پھر بگڑ گئے۔ اُنھوں نے کہا کہ ناممکن باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل جو چیز ختم ہوگئی وہ دوبارہ پیدا نہیں ہوسکتی۔ ان کا اصرار تھا کہ اب اس باب کو بند کر دینا چاہیے لیکن میں نے ان سے پھر کہا کہ مولانا ایسے ادارے روز روز قائم نہیں ہوا کرتے اگر اس وقت چھوڑ دیا گیا تو برسوں کی محنت خاک میں مل جائے گی۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی مشغولیات دوسری ہو چکی تھیں لیکن انھوں نے ختم کر دینے پر اصرار نہیں کیا اور کہا کہ آپ کا خیال ہے تو کر کے دیکھیے، مجھے اُمید نہیں۔ میں نے پوری جدوجہد سے ایک بار پھر اس ادارے کو قائم کیا اور آج یہ جیسا بھی ہے، سب کے سامنے ہے۔ ہم مکمل طور پر تباہ ہوئے تھے اور ہم نے انسانیت سوز اور بے رحمانہ قتل و غارت کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور برداشت کیے لیکن اس کے باوجود میرے ذہن میں کوئی تلخی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میں ایک ہی بات کہتا ہوں کہ اس زمانے میں ہم پر جو لوگ فرقہ واریت کا الزام لگاتے ہیں وہ نہ صرف حق و انصاف کا خون کرتے ہیں، بلکہ بڑی زیادتی سے بھی کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر گرگیش ماتھر نے اپنے ایک کتابچہ "مسلمان اور علیحدگی پسند سیاست" کے صفحہ نمبر ۵۶ پر مجھے علماء اور مسلم سیاست دانوں کے اس گروپ کا رہنما بتایا ہے جن کا ایک

© rasailojaraid.com